# اسلام، جمہوریت اور مغرب

رابن رائٹ*

ترجمہ: عبدالحمید اعظمی

ایرانی انقلاب [۱۹۷۹ء] نے دنیا کی پہلی جدید مذہبی حکومت (theocracy) کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کے تیرہ سال بعد ایک بار پھر اسلام ایک توانا سیاسی مفہوم میں اجاگر ہوا ہے۔ نہ صرف مشرق وسطیٰ میں بلکہ شمالی اور مغربی افریقہ سے وسط ایشیا کی ریاستوں تک اور ہندوستان سے مغربی چین تک اسلام سیاسی نظام کے لیے ایک قوی اور نمایاں قوت کی حیثیت سے نمایاں ہو رہا ہے۔ اسلام کی اچانک اور پرجوش نئی حرکت پذیری اس منزل تک پہنچ گئی ہے کہ اشتراکیت کے سیاسی منظر سے غائب ہونے کے بعد یہ تاثر یا غلط فہمی عام ہوتی جارہی ہے کہ نظریاتی سطح پر مغرب کا اگر کوئی مدمقابل ہوسکتا ہے تو وہ فقط اسلام ہے۔

اسلام پسندی کی اس نئی لہر کا آغاز ۱۹۸۰ء کے اواخر سے ہوا۔ جو ایران کے ۱۹۷۹ء، لبنان کے ۱۹۸۲ء اور مصر، سعودی عرب، کویت، شام اور دیگر ممالک کے قدرے چھوٹے گروہوں کے اسلامی تجربوں سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔

یہ فرق اپنے حلقہ اثر اور طریقہ کار کے لحاظ سے نمایاں ہے۔ پہلا مرحلہ اسلام کے ثانوی فرقے شیعہ مسلمانوں سے زیادہ متعلق تھا۔ ایرانی انقلاب کے علاوہ لبنان میں حزب اللہ، عراق میں دعوۃ جیسے گروہ جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی ساحل پر شیعہ آبادی والے علاقوں میں نمایاں طور پر مصروف عمل تھے۔ تاہم اسلامی احیا کی تازہ ترین تحریکیں سنی مسلمانوں میں سر اٹھا رہی ہیں جو دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کا ۸۵ فیصد ہیں۔ سنی مسلمان دنیا کے ۷۵ ملکوں میں اتنی تعداد میں آباد ہیں کہ ان ممالک کی حیثیت

* رابن رائٹ لاس اینجلس ٹائمز کی صحافی ہیں، جنہوں نے یہ مقالہ جان ڈی اور کیتھرین ٹی میک آرتھر فاؤنڈیشن سے وظیفہ ملنے پر تیار کیا تھا۔

دارالاسلام کی سی ہے۔ لبنان، عراق، ایران اور یمن کے ماسوا افریقہ سے مشرقی بحیرہ روم اور بحیرہ آ ژ کے ساحلی علاقوں، جزیرہ نمائے عرب، وسط ایشیا کی نو آزاد جمہوریتوں، مغربی چین، جنوبی ایشیا اور سب سے زیادہ آبادی والی مسلم ریاست انڈونیشیا تک کے ممالک میں سنی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

اس انتہا پسندی کے برخلاف جو اسلامی احیاء کے پہلے مرحلے کی خصوصیت تھی یعنی سیاسی بدامنی، خودکش بمباری، ہوائی جہازوں کا اغوا وغیرہ -- تازہ اسلامی احیاء کا دائرہ عمل جاری نظام کے اندر ہی تک محدود رہتا ہے۔ ۱۹۸۹ء سے، مثال کے طور پر، اسلام پسندوں کے مختلف گروہوں نے اردن اور الجزائر میں پارلیمانی انتخابات میں حصہ لیا ہے۔ انڈونیشیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک نے، جسے چار کروڑ افراد کی حمایت حاصل ہے، قیام جمہوریت کے لیے مطلق العنان حکومت کے خلاف پرامن مظاہرے کیے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں روس کے حصے بخرے ہونے کے بعد سے وسطی ایشیاء کی سابق ریاستوں میں تحریک اسلامی کے حامیوں نے اپنی سالہا سال کی زیرزمین تحریکوں کو ختم کرنے کے لیے قانونی حیثیت کے حصول کی درخواستیں پیش کی ہیں تاکہ وہ سیاسی عہدوں کے لیے انتخابات میں شرکت کر سکیں۔

مختلف ملکوں اور گروہوں میں ووٹ کو گولی پر ترجیح دینے کی وجوہات بہت سی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں اس امر کا احساس ہو چکا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے کی انتہا پسندی کی انہیں بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ مثال کے طور پر ایران کی معیشت اس کے تنہا ہو جانے کی وجہ سے ترقی کے بجائے تنزلی کا شکار ہوئی۔ مزید براں اشتراکیت کے خاتمے کے بعد وسط ایشیائی ریاستوں میں مطلق العنانیت اور مغرب سے مخاصمت کے خطرات نمایاں ہوئے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں اسلام پسندوں کو اس حقیقت کے اعتراف میں دیر نہیں لگی کہ معاشرے میں گوناگوں مفادات کی موجودگی [کثرتیت] اور باہمی انحصار ہی پر ترقی کا دارومدار ہے۔ اگرچہ تعاون نے ابھی کلی طور پر تصادم کی جگہ نہیں لی ہے تاہم اہم خطوں میں اسلام پسند اب پہلے کی طرح ہر ناپسند بات پر فوراً نہیں بھڑک اٹھتے۔

صدیوں کی بے عملی، نوآبادیاتی نظام اور مغربی نظریات کے تجربات کی ناکامی کے پیش نظر بہت سے اسلام پسند محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اس صورت حال میں مثبت متبادلات پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔

علاوہ بریں سیاسی اور معاشی عالمی تبدیلیوں کے ایسے ہی عوامل کے تحت اسلامی تحریک کے حامیوں کی روز افزوں تعداد جدید زندگی، سیاسی مسابقت اور آزاد تجارت سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے اپنے اخلاقی اور دینی عقائد میں گنجائشیں تلاش کر رہی ہے۔ ابھی تک صرف محدود تعداد میں اسلام پسندوں نے مناسب یا مکمل حل پیش کیے ہیں۔ ''اسلام تمام عالمی مسائل کا حل ہے'' ایک مقبول نعرہ ہے لیکن صرف اتنا کافی نہیں۔

سیاست کے رنگ میں رنگا ہوا اسلام تنہا نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام پر مذہب دنیا بھر میں تبدیلی کے لیے فعال اور محرک قوت بن چکا ہے۔ ترقی کی جدوجہد میں مصروف معاشروں میں، جو ناکام اور نااہل نظام سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور قابلِ عمل متبادل کی تلاش میں ہیں، انہیں مذہب معیارِ کمال، شناخت، قانونی جواز، اور بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ مشرقی ایشیا میں بدھ مت، مشرقی یورپ، لاطینی امریکہ اور فلپائن میں کیتھولک، ہندوستان میں سکھ اور ہندو بلکہ خود اسرائیل میں یہودی اپنے اپنے نصب العین کے تعین اور ان کے حصول کی جدوجہد کو تیز کرنے کے لیے کسی نہ کسی حد تک اپنے اپنے مذہب کا سہارا لے رہے ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں میں جاری متعدد تحریکیں بھی عمیق تر جستجو کی عکاس ہیں تاکہ تحریک اسلامی کے حامیوں کا حلقہ اثر وسیع تر اور دیرپا ہو کیونکہ اسلام ہی وہ اکلوتا توحید پرست مذہب ہے جو نہ صرف روحانی عقائد پیش کرتا ہے، بلکہ وہ معاشرے کو ایک نظام کے تابع بنانے اور چلانے کے اصول بھی متعین کرتا ہے۔ جدید عالمی نظام میں اپنی جگہ بنانے کے تقاضے کے علاوہ اسلام ارتقاء کے اس مرکزی اور اہم ترین مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جسے پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح مذہب (Reformation) کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مذہب کے روایتی کردار، قیادت، تنظیم، ترجیحات و تصریحات پر تنقیدی نظر ڈالی جا رہی ہے۔

تحریک اسلامی کے ناموں سے بھی اس تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلامی احیاء کے ابتدائی مرحلے میں متعدد گروہ لبنان، مصر اور اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں میں مصروفِ عمل تھے جنہیں اسلامی جہاد یا مذہبی جنگ کا نام دیا گیا تھا۔ جبکہ تازہ ترین تحریکوں میں، تیونس سے تاجکستان تک جو گروہ نمایاں ہیں، وہ خود کو

تحریک نہضتِ اسلامی (Islamic Renaissance Party) کہتے ہیں۔ یہ آزمائش خود اسلام میں بھی اتنی ہی موجود ہے جتنی ان ملکوں اور نظاموں میں جہاں مسلمان آباد ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں خدا اور بندے کے درمیان اور انسان اور انسان کے مابین باہمی روابط کا از سرِ نو تعین جن مرحلوں سے گزر کر مغرب نے کیا تھا، فی زمانہ اسلام بھی انہیں مراحل سے گزر رہا ہے۔ اسلامی احیاء کے حامیوں کے لیے یہ کام اور بھی دشوار ہے کیونکہ داخلی اور بین الاقوامی سیاسی ماحول، اصلاحات اور تجرباتی عمل کے لیے ابھی سازگار نہیں ہے کجا یہ کہ مکمل اظہار کی بات کی جائے۔

ایرانی انقلاب کے دوران ہونے والی زیادتیوں اور لبنان میں دہشت گردوں کے بڑھتے ہوئے جوش و جذبہ کے سبب اسلام کے بارے میں مقامی اور مغربی رویہ متاثر ہو رہا ہے۔ اسی لیے ابھی تک اسلام کو غلطی سے، بنیادی طور پر، انتہا پسند نظریات کا حامل سمجھا جا رہا ہے حالانکہ اس تصور کے خلاف بے انتہا ثبوت موجود ہیں۔

اسلامی حرکت پذیری (activism) کی متعدد شکلیں اور کیفیات ہیں لیکن اسے بھی بے جا طور پر واحد اور یکساں وجود کی حامل قوت کے طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ اسلام پسندوں کی جدید حرکت پذیری یا فعالیت (activism) اسلامی دنیا کی دو جغرافیائی انتہاؤں شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا میں نمایاں طور پر منعکس ہو رہی ہے۔ دونوں علاقوں میں، ۱۹۹۰ء سے، اسلام سوشلسٹ حکومتوں کے مدمقابل اہم چیلنج بنا ہوا ہے۔ دونوں خطے اس لحاظ سے مغرب کے لیے بھی ایک مسئلہ ہیں جو سالہا سال کی کشاکش کے بعد اسلام سے اپنے تعلقات کا تعین کر رہا ہے۔

اسلام اور جمہوریت میں مکمل ہم آہنگی کے ضمن میں الجزائر کا تجربہ نہایت اہم ہے۔ الجزائر میں اسلامی فعالیت کا آغاز اس وقت ہوا جب صدر شاذلی بن جدید کے یک جماعتی نظام کو اس وقت ختم کرنا پڑا جب ۱۹۸۸ء میں عوامی مظاہروں میں چار سو افراد جان سے مارے گئے۔ انتقالِ اقتدار کے تین اقدامی طریق کار کے پہلے مرحلہ میں ۱۹۹۰ء کے مقامی انتخابات میں اسلامی سالویشن فرنٹ (FIS) نے علاقائی اسمبلیوں کی ۶۰ فیصد اور میونسپل کونسلوں کی ۵۵ فیصد نشستیں حاصل کر کے حیران کن کامیابی حاصل کی۔ نیشنل لبریشن فرنٹ (FLN) دوسرے نمبر پر آیا جو فرانسیسی نو آبادیاتی نظام کے خلاف آٹھ سالہ جنگ میں

کامیاب ہونے کے بعد سے متواتر حکمران چلا آ رہا تھا۔ یہ ۱۹۶۲ء میں آزادی کے بعد پہلے آزاد کثیر جماعتی انتخابات تھے جن میں نیشنل لبریشن فرنٹ (FLN) کو مسترد کر دیا گیا اور اسلام پسندوں کی حمایت سامنے آئی۔ نیشنل لبریشن فرنٹ نے تین دہائیوں تک حکومت کی جو بالآخر اپنی نااہلیوں اور بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کے سبب اختتام کو پہنچی۔

۱۹۹۲ء تک الجزائر کی ڈھائی کروڑ آبادی میں سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ باشندے خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے تھے۔ الجزائر میں تیل کے محاصل کا تقریباً ۷۰ فیصد، ملک پر مسلط ۲۵ ارب ڈالر کے غیر ملکی قرضے [کی اقساط] کی ادائیگی پر خرچ ہو جاتا تھا اور حکومت کے پاس اتنے وسائل نہیں بچتے تھے کہ وہ عوام کے مسائل مثلاً مکانوں کی شدید قلت، بے روزگاری، غیر معیاری تعلیم، معاشرتی سہولتوں اور محدود ترقیاتی کاموں پر کچھ خرچ کر سکتی۔ اس کی آبادی کا ۶۵ فیصد ۳۰ سال سے کم عمر نوجوانوں پر مشتمل ہے جسے الجزائر کے انقلاب کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔

ان حالات میں تحریک اسلامی کے چاق و چوبند کارکنوں نے مفصل تو نہیں مگر ایک جائز اور مقبولِ عام متبادل کی پیشکش کی۔ ان کی مقبولیت کا اظہار اس وقت ہو گیا جب پٹرول پمپوں، اخبارات، حتیٰ کہ کوڑہ کرکٹ اکٹھا کرنے والوں نے بھی ان کی ہڑتال کی اپیل پر لبیک کہا۔ جب بحیرہ روم کے مرکزی شہر میں گندگی کے ڈھیر لگ گئے تو اسلام پسندوں نے اپنے حمایتیوں کو اپنے ہاتھوں سے یہ کوڑا صاف کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اسلام پسندوں کی اس کارگزاری نے لبریشن فرنٹ کی خامیوں کو بہت زیادہ اجاگر کر دیا۔ مقامی انتخابات کے پہلے مرحلے میں عوام کی جس غالب رائے کا اظہار ہوا اس کے سبب پارلیمانی انتخابات کے نتائج کا اندازہ لگانا بہت آسان تھا۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں انتخابات کے پہلے مرحلے میں ۵۰ جماعتوں نے شرکت کی۔ تاہم FIS نے ۲۳۱ میں سے ۱۸۸ نشستیں حاصل کر لیں اور اکثریت حاصل کرنے کے لیے اسے صرف ۲۸ نشستوں کی ضرورت تھی۔ اس بار FLN ۱۵ نشستوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر آئی۔ ۲۵ نشستیں سوشلسٹ فورسز فرنٹ نے حاصل کیں جس پر بربر حاوی تھے۔ ایک اور اسلامی جماعت حماس چوتھے نمبر پر آئی۔ اگرچہ پارلیمانی انتخاب میں FIS کو مقامی انتخابات سے دس لاکھ ووٹ کم ملے تاہم ۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء میں طے شدہ دوسرے مرحلے کی ۱۹۹ نشستوں کے انتخابات میں اسے اکثریت حاصل

ہونے کی پوری توقع تھی۔

یہ دو انتخابات سیاسی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انقلابِ ایران کے بعد سے کسی اسلامی جماعت نے اتنی عظیم کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ اور کسی اسلامی جماعت نے اب تک طویل عرصے سے برسراقتدار قوت کو جمہوری طریقے سے اتنے فیصلہ کن انداز میں شکست نہیں دی تھی۔ لیکن دنیا کی پہلی اسلامی جمہوریت کو موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنے آپ کو ثابت کر سکتی۔

انتخابات سے صرف پانچ روز قبل وزیر دفاع خالد نظار نے خاموش انقلاب کے ذریعے صدر شاذلی بن جدید کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان کی جگہ پانچ رکنی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی نے نظم و نسق سنبھال لیا اور انتخابات روک دیے گئے۔ چند ہفتوں اندر اندر FIS کے قائدین کو قید کر کے جماعت پر پابندی لگا دی گئی۔ FIS اور حماس کے ۸۸۰۰ اور بعض کے مطابق ۳۰۰۰۰ جوشیلے کارکنوں کو مارچ کے اختتام تک گرفتار کر کے جنوبی صحرائے اعظم میں واقع خصوصی کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے نتائج کو مسترد کرنے کے لیے FIS کے ٹکٹ پر کامیاب درجنوں میئروں اور مقامی اسمبلیوں کے قائدین کو بھی گرفتار کر کے اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔

یوں تو اس کا نشانہ اسلام پسند تھے لیکن اصل زد جمہوریت پر پڑی۔ الجزائر کی حکومت نے یہ بھی اشارہ دیا کہ وہ ۱۹۹۳ء کے اواخر تک صدارتی انتخابات کرائے گی تاکہ انتخابات کے سلسلے کا آخری مرحلہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے، لیکن اس عمل میں FIS کی شرکت کا کوئی امکان نہیں۔ نئی حکومت کی دراصل کوشش تھی کہ عبوری دور میں بیرونی امداد، قرضوں اور تیل کے حقوق کی فروخت سے حاصل شدہ رقم کو ان عوامی شکایات کو رفع کرنے پر صرف کرے، جس کی بنا پر عوام نے FIS کو ووٹ دیے تھے۔ حکومت یہ بھی چاہتی تھی کہ دستور میں ایسی ترامیم کر دی جائیں کہ آئندہ FIS کے سیاست میں آنے کے تمام دروازے بند ہو جائیں۔ ۲۹ اپریل کو الجزائر کی سپریم کورٹ نے FIS کی تحلیل کا فیصلہ سنایا۔

بن جدید نے ملک میں کثیر جماعتی نظام کو بتدریج رائج کرنے کا جو طریقہ اپنایا تھا اس کے سبب ملکوں میں سیاسی جماعتوں کا سیلاب آ گیا۔ سرکاری سرپرستی میں شائع ہونے والے چند محدود سے اخبارات کی جگہ بے شمار آزاد خیال اخبارات اور اپنی رائے کا برملا اظہار کرنے والی مطبوعات نے لے

لی۔ چند افراد تک محدود بحث وتمحیص کے موضوعات عوامی انجمنوں میں آزادی سے زیر بحث آئے، جبکہ عوامی مفاداتی گروہ بشمول حقوقِ انسانی کی تحریک، پھلنے پھولنے لگے۔

اہم ترین تبدیلی یہ آئی کہ الجزائر کے محرومی کے شکار طبقوں کو ایک نئی قوت حاصل ہوئی جس نے ان کو حوصلہ دیا اور انہیں احساس ہوا کہ اس جذبہ کو اگر روکا جائے تو اس کے نتائج اچھے ثابت نہیں ہوتے۔ حکومتی فوجی ٹولے نے بھی مکمل منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ فوج نے ایک معمر انقلابی ہیرو محمد بودائیف کو اقتدار سنبھالنے والی کونسل کا سربراہ متعین کیا، جنہیں ان کے ساتھیوں سمیت گزشتہ حکومت نے فوج سے اختلاف کی بنا پر ۱۹۶۳ء میں ملک بدر کر دیا تھا۔

گرفتار ہونے والوں پر بہت زیادہ سختی کی گئی۔ مطلوبہ اسلام پسند نہ ملے تو اس کے عزیز واقارب کو فوج گرفتار کر کے لے جاتی۔ ان میں سے متعدد گرفتار ہونے والوں کو مختصر سی عدالتی کارروائی کے بعد دو سے بیس سال کے لیے قید کی سزائیں دی گئیں۔ حکومت نے مساجد کے قرب وجوار میں جلسوں کے انعقاد کی ممانعت کر دی، حتیٰ کہ ملک کی ۹۰۰۰ مساجد میں سے ۴۰ فیصد کے ائمہ تبدیل کر دیے گئے اور ان کی اچھی خاصی تعداد کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔ جنگِ آزادی کے بعد سے اب تک الجزائر کے باشندوں کو ایسے جبری سلوک سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ بایں ہمہ حکومتی ٹولہ کی ناکامی کا امکان زیادہ ہے کیونکہ انہوں نے اس قوت یعنی اسلام کو ایک نیا جواز فراہم کر دیا ہے جسے وہ دبانا چاہتے تھے۔

فوجی انقلاب کے بعد FLN کے حصے بخرے ہو گئے، کچھ انقلاب کے حمایتی تھے اور کچھ مخالف۔ جبکہ مخالف جماعتیں فوجی ٹولے کے خلاف موثر رائے عامہ پیدا نہ کر سکیں۔ اس افراتفری میں FIS ہی وہ قوت رہ گئی تھی جو جمہوریت کے لیے سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ اس تحریک کا نظم وضبط اس قابل تھا کہ جس نے اسے انقلاب کے بعد سہارا دیا۔ مساجد کے گرد فوج اور پولیس کے محاصرہ کے باوجود FIS کے قائدین نے تحمل سے کام لینے پر زور دیا۔ FIS کے قائم مقام قائد عبدالقادر ہاشانی نے نماز جمعہ کے زبردست اجتماعات میں یہ اعلان کیا کہ "فوج ہمیں زچ کرنا چاہتی ہے لیکن ہم ان کے جال میں نہیں آئیں گے۔ ہم کسی صورت مشتعل نہیں ہوں گے"۔

اگرچہ FIS کی تحریک کے مختلف پہلو ہیں، اس کے اراکین فعالیت کی مختلف سطحوں پر کام کرتے

ہیں اوران میں اسلامی جمہوریت کے بارے میں مختلف آراء موجود ہیں، تاہم سب اس امر پر متفق تھے کہ خون خرابے سے اجتناب بہتر ہے۔ بڑے پیانے پر گرفتاریوں کے باوجود، فوجی انقلاب کے دو ماہ بعد، FIS کے مطالبات یہ تھے کہ گرفتاریوں کا سلسلہ ختم کر کے گرفتار ہونے والوں کو آزاد کر دیا جائے، اسلامی تحریک کے کارکنوں کی ایذا رسانی بند کی جائے، تمام سیاسی جماعتوں سے مذاکرات شروع کر کے انتخابات کے بقیہ عمل کی تکمیل کی جائے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انہوں نے جہاد کا اعلان نہیں کیا۔ تاہم حفاظتی فوجی دستوں پر اکادکا حملے وہ انتہا پسند تنظیمیں کرتی رہیں جو FIS کے زیرِ اثر نہیں تھیں۔ ان میں سے ایک ''ہجرہ وتکفیر'' ہے اور دوسری 'افغان' کہلاتی ہے، جو ان افراد پر مشتمل ہے جنہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں روسی قبضے کے خلاف جنگ افغانستان میں حصہ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اِن میں سے متعدد کو CIA نے پاکستان میں عسکری تربیت دی تھی۔

لیکن تحریص وترغیب کے باوجود FIS نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جمہوریت کو ترک نہیں کیا۔ عرب اور مسلم دنیا کے لیے الجزائر محض اسلام اور جمہوریت کے تعلقات کے ضمن میں ایک مثالی آزمائش نہیں ہے بلکہ اس سے یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا مغرب اور اسلام میں مفاہمت ممکن ہے؟

اس معاملے میں مغرب کی کارکردگی فوجی ٹولے سے بہت بہتر نہیں تھی۔ الجزائر کے فوجی انقلاب کے بعد مغرب نے بے حد معمولی ردعمل ظاہر کیا۔ ابتدا میں امریکی وزارت خارجہ نے سرکاری طور پر الجزائر میں جمہوری نظام میں رکاوٹ پیدا ہونے پر اظہار تاسف کیا مگر اس کے بعد مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ متعدد مغربی حکومتوں نے فوجی حکومت کے نمائندوں کو اپنے ہاں سرکاری دورے پر مدعو کیا تاکہ وہ انہیں اپنے مقاصد اور منصوبوں سے آگاہ کرسکیں۔ چند ممالک نے انہیں امداد کی بھی پیشکش کی۔ یورپ اور امریکہ کے بنکوں کے ایک کنسورشیم نے الجزائر کو قرضے کے سود کی اقساط ادا کرنے کے لیے ۱ء۴۵ ارب ڈالر فراہم کیے۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اگلے برس کے موسم خزاں کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ کے صدر بش نے فرمایا کہ ''دنیا میں ہر جگہ عوام ایسی حکومت کے طالب ہیں جو عوام کی ہو اور عوام ہی

کے لیے ہو۔ وہ آزادی کی نعمت، جائداد اور اپنی ذات کے حقوق سے مکمل طور پر مستفید ہونا چاہتے ہیں''۔ انہوں نے آگے چل کر فرمایا کہ ''امریکہ عالمی سطح پر ان حقوق کی حمایت کرتا ہے''۔ اگر الجزائر کو فی الحقیقت ایک مثال قرار دیا جاسکتا ہے تو یہ اس استثناء کے ساتھ ہے کہ اس ملک میں جمہوری طور پر منعقد انتخابات میں اسلام پسند عناصر کامیاب ہوئے [اور انہیں حکومت سے محروم رکھا گیا]۔

ایسے وقت میں جب بش انتظامیہ سیاسی کثرتیت (pluralism) کی شدومد سے وکالت کر رہی ہے، [الجزائر کے معاملے میں] امریکہ کا کمزور ردِعمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ وائٹ ہاؤس اسلامی جمہوریت پر پولیس اسٹیٹ کو ترجیح دیتا ہے۔ پیرو میں جب صدر نے دستور کو معطل کر دیا اور اپریل میں پارلیمنٹ کو ختم کر دیا تو دنیا نے بہت شور مچایا، مغرب نے پرزور مذمت کی، لیکن الجزائر کے معاملے میں خاموشی اختیار کی گئی۔ نتیجتاً فوجی حکومت کی حوصلہ افزائی ہوئی کہ وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنائے۔ اسی حقیقت کو FIS بیانگ دہل بیان کر رہی ہے۔

FIS کی تحریک کے خیالات تکلیف دہ حد تک غیر واضح ہیں۔ اپنے اٹھارہ ماہ کے دور میں FIS کی میونسپل اداروں میں کارگزاریوں پر ملی جلی رائے کا اظہار کیا گیا۔ بجٹ کی رقوم کی فراہمی پر FLN کے گورنروں سے شدید اختلافات ہی اس کا سبب تھے۔ FIS کی بار بار یقین دہانیوں کے باوجود دیگر جماعتوں کو یہ تشویش تھی کہ اسلام پسند انہیں ممنوع قرار دے کر ایران جیسی کٹر مذہبی حکومت قائم کر دیں گے۔

تاہم اس امر پر بحث کی جاسکتی ہے کہ الجزائر اسلامی جمہوریت کے تجربے کے لیے موزوں ترین جگہ ہے۔ بحیرہ روم کے ساحل پر مغرب کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے یہاں مغرب کا اثر ورسوخ کافی گہرا ہے۔ یہ صورت حال ایران کے برعکس ہے جہاں مغرب کو قوت تو حاصل تھی لیکن جغرافیائی فاصلہ زیادہ ہے۔ الجزائر کے اسلام پسند مغرب کے اندیشوں کے حوالے سے غیر معمولی طور پر حساس ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ معاشرے کو اسلامی رنگ دینے میں مرکزی مسئلہ شریعت کے نفاذ کا ہے، جس میں اسلامی قانون یا تو براہ راست قانون ہے، یا قانون کا ماخذ۔ لیکن یہ اقدام ضروری نہیں کہ مغربی مفادات سے متصادم ہو۔ پاکستان اور سعودی عرب کے مغرب سے بڑے خوشگوار تعلقات ہیں حالانکہ

دونوں ان اسلامی ممالک میں شامل ہیں جہاں شریعت کو بالادستی حاصل ہے۔

تیسرے یہ کہ صدارتی انتخابات ۱۹۹۳ء میں ہونے تھے اور انتقالِ اقتدار کے درمیانی مرحلے میں [منتخب شدہ حکومت کی راہ میں] ایک خود بخود پیدا شدہ بندش حائل تھی۔ FIS کو پارلیمانی انتخابات میں جتنی بھی اکثریت حاصل ہو جاتی صدر بن جدید کو پہلے دو سال کے لیے آئین میں کسی بنیادی تبدیلی کے خلاف ویٹو کا حق حاصل رہتا۔ آخری یہ کہ زیادہ بہتر ہوتا اگر اسلام پسند اپنی کارکردگی کے لیے عوام کے سامنے جواب دہ رہتے بجائے اس کے کہ نظامِ حکومت سے باہر رہ کر وہ خفیہ طور پر اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔

فوجی انقلاب کی وجہ سے تشدد کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بدقسمتی سے یہ جبر وتشدد الجزائر کے آزادی کے مطالبات کے جواب میں فرانس کے جبر واستبداد کے مماثل تھا جس کی وجہ سے تیسری دنیا میں طویل ترین اور خونی جنگوں میں سے ایک شروع ہوئی تھی۔ مارچ کے اواخر میں FIS نے ایک بیان جاری کیا کہ حکومت کا مذاکرات سے انکار اور اس کے جابرانہ اقدامات کے نتیجے میں ممکن ہے کہ ان کے حامی عوام کو اپنی پسند کی حکومت منتخب کرنے کا حق دلوانے کے لیے قوت کے استعمال پر مجبور ہو جائیں۔ FIS کے خاتمے کے سرکاری حکم کے اجرا سے مزید تشدد کو ہوا ملی۔

جو کچھ الجزائر میں ہوا اس سے باقی اسلامی دنیا کا متاثر ہونا بھی یقینی تھا۔ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے ان ممالک نے فوجی حکومت پر دباؤ ڈالنے سے احتراز کیا یا اس کی مخالفت میں بیان جاری نہیں کیا تو ان حالات میں جب تحریک اسلامی جمہوریت کی جانب قدم بڑھا رہی ہو اسے اسلام دشمن رویہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس احساس کا اثر الجزائر کے علاوہ دیگر اسلامی ملکوں پر بھی تا دیر قائم رہے گا۔

وسطی ایشیا کی سابق روسی ریاستیں وہ اہم خطہ ہیں جہاں اسلامی جذبات عروج پر ہیں۔ وسطی ایشیا کی سیاست میں اسلام کا کردار نیا نہیں ہے۔ آٹھویں صدی سے اسلام اس خطے کو متحد رکھنے والی قوت تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ترکستان میں چنگیز خان اور تیمور لنگ کے عرصہ ہائے اقتدار میں اسلام نے سائنس اور علوم وفنون میں اپنی بے مثال پیش رفت کے ساتھ ترقی کی معراج حاصل کی تھی۔ آج بھی اس خطے کے آثار و عمارات اس بے مثال عروج کی داستانیں بیان کر رہے ہیں۔

اگر چہ پہاڑی چراگاہوں میں رہنے والے خانہ بدوش قبائل پر اسلام کے اثرات یکساں نہیں تاہم اس وقت تک اسلام یہاں پھلتا پھولتا رہا جب انیسویں صدی میں زاروں کے روس نے ترکستان کو اپنے اندر ضم کر لیا اور مذہب کو بدنام کرنا شروع کیا۔ پھر جب بالشویک انقلابیوں نے اس علاقے کو علاقائی خود مختاری دینے سے انکار کر دیا تو اس حق کے حصول کے لیے چھ سالہ عسکری جدوجہد میں اسلام بھی ایک قوت کے طور پر نمایاں رہا۔

۱۹۲۰ء میں بسماچی قبائل نے خفیہ طور پر ایک نئی ریاست ''آزاد ترکمانستان اسلامی جمہوریہ'' کے قیام کا اعلان کیا۔ لیکن روسی افواج کے سامنے اس کے قدم نہ جم سکے۔ اسلامی اور ترک قبائل کے اتحاد کی مزید تحریکوں کو روکنے کے لیے اسٹالن نے جبری طور پر ترکستان کو پانچ ریاستوں میں تقسیم کر کے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائی میں روسی باشندوں کی کثیر تعداد کو وہاں آباد کر دیا۔ تاہم سات دہائیوں کے جبر کے باوجود علاقے کے چھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت نے گھروں اور غیر قانونی مساجد میں اسلامی تعلیمات و عبادات کا سلسلہ جاری رکھ کر اسلام سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔

۱۹۹۰ء میں ''ضمیر کی آزادی'' کے روسی قانون کے نفاذ کے بعد سے وسطی ایشیا میں اسلامی بیداری کی حیران کن لہر پیدا ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق روس، چین، ایران اور افغانستان کی سرحدوں پر واقع معدنی وسائل سے مالا مال ریاستوں میں روزانہ دس مساجد تعمیر ہوئیں۔ مذہبی مدارس اور ان میں طلبا کی تعداد میں انتہائی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ علاقے کی سیاسی زندگی کے لیے اہم امر یہ ہے کہ تحریک نہضت اسلامی (Islamic Renaissance Party) کی شاخیں قریہ قریہ کھلنے لگیں۔ اگرچہ یہ تنظیم ۱۹۹۱ء میں ماسکو میں خود کو قانونی تنظیم کے طور پر رجسٹرڈ کرانے میں کامیاب ہوگئی، تاہم کمیونسٹوں کے اس خوف کی بنا پر کہ اسلام ایک سیاسی قوت بن سکتا ہے وسط ایشیاء کی پانچ میں سے چار ریاستوں میں اس تنظیم کی سرگرمیوں پر پابندی رہی۔

وسطی ایشیا کو، جو روسی تسلط کے دوران سب سے زیادہ قدامت پرست علاقہ تھا، آئندہ تین سال سے زیادہ عرصے تک نمایاں سیاسی تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر جب پہلی بار سوویت یونین سے آزادی کے بعد پارلیمانی انتخابات کا مرحلہ آیا۔ ان انتخابات میں کٹر اشتراکی قائدین کا مقابلہ، جنھوں نے

اپنی جماعت کا نام تبدیل کر لیا تھا، نئے جمہوریت پسندوں اور اسلامی تحریک کے ابھرتے ہوئے کارکنوں سے ہوا۔ ان مثالوں کے باوجود جو یورپی جمہوریتوں نے قائم کی تھیں وسطی ایشیا کے کمیونسٹوں نے اس خطے میں آزاد سیاسی نظاموں کی ترویج میں کم ہی دلچسپی ظاہر کی۔ اور معاشی آزادی کے دعوؤں کے باوجود ایسے سرکاری اداروں اور املاک کی فروخت کی اجازت کم ہی دی گئی جو ان کے لیے سیاسی اور معاشی قوت اور سرپرستی کا ماخذ بن سکیں۔

دیگر مسلمان معاشروں کی طرح وسطی ایشیا کو بالواسطہ یا بلاواسطہ جمہوریت سے روشناس ہونے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔ حتیٰ کہ کرغستان میں بھی، جہاں صدر جو پہلے کمیونسٹ تھے اور پھر انہوں نے جمہوری اصولوں کو تسلیم کیا، جمہوریت ایک غیر مانوس تصور نظر آتا ہے۔ بیشتر عوام جمہوریت کو سیاسی آزادی سے زیادہ معیشت سے منسلک تسلیم کرتے ہیں۔ کرغستان کی جمہوری تحریک کے قائدین کا خیال ہے کہ جمہوریت کی مکمل تفہیم اور اس خطے میں جڑ پکڑنے کے لیے اگلی نسل کا انتظار کرنا ہوگا۔

دیگر ریاستوں میں ازبکستان کی برلک (Birlik)، تاجکستان کی جمہوری پارٹی، جیسی جمہوریت پسند جماعتیں اب تک صرف دانشوروں کے مختصر گروہ کو ہی متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وسط ایشیائی عوام ڈیڑھ سو سالہ روسی نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد فطری طور پر اپنی ثقافتی اور تہذیبی اصل کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ وہ اپنی ترکی اور فارسی زبانیں دوبارہ اختیار کر رہے ہیں اور ماسکو کے مسلط کردہ روسی رسم الخط کو ترک کر رہے ہیں۔ زندگی کے آداب اور روزمرہ کو جو متروک ہو چکے تھے دوبارہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے مستقبل کی تشکیل نو میں اسلام ایک فعال عنصر ہے۔

تاہم اس مرحلے پر خود اسلام کے اندر ''سرکاری'' اور ''غیر سرکاری اسلام'' میں کشمکش جاری ہے۔ اشتراکی دور میں وسطی ایشیا میں نئے اماموں اور معدودے چند مساجد کو مذہبی معمولات ادا کرنے کی اجازت تھی، جن پر مکمل ریاستی کنٹرول تھا۔ ۱۹۷۰ء کے اواخر سے حکومت مخالف مسلمانوں نے زیرزمین تحریک شروع کر رکھی تھی۔ وہ لادین اشتراکی حکومت کے خلاف عوام کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے اور خفیہ مساجد میں عبادات انجام پاتی تھیں۔

بیشتر نئی مساجد مقامی لوگ تعمیر کر رہے ہیں جن کا غیر سرکاری اسلام سے رابطہ ہے۔ اپنا تسلط جمانے کے لیے روس نے تاشقند میں مسلمانوں کے لیے روحانی نظامت قائم کی تھی جس کی قیادت کی تبدیلی کی کوششیں کی گئیں۔ اس مرحلے پر تحریک نہضت اسلامی کی شاخوں نے معتدل اہداف اپنائے ہوئے ہیں۔ اکثر ان کا مقصد سیاسی، معاشی، مذہبی نظاموں میں کمیونسٹ بالادستی کو ختم کرنا ہے۔ وہ اسلامی ثقافت کے احیا، شراب نوشی، منشیات اور عصمت فروشی پر پابندی کے حق میں ہیں۔

وسط ایشیائی ریاستوں سے اسرائیل جو تعلقات استوار کر رہا ہے بیشتر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اکثریت کو شرعی قوانین کے نفاذ کی خواہش ہے لیکن کوئی یہ نہیں چاہتا کہ ملاّ کی حکومت ہو یا ایرانی طرز کی مذہبی ریاست وجود میں آئے، جہاں دیگر سیاسی جماعتوں کو عمل کرنے کی اجازت ہی نہ ہو۔ تاجکستان وسطی ایشیاء کی واحد ریاست ہے جہاں فارسی بولی جاتی ہے۔ یہاں کے اسلامی قائدین نے ایرانی طرز حکومت کو اسی بنا پر مسترد کر دیا کہ ان کی ریاست میں شیعہ اور سنی دونوں آباد ہیں۔ انتہاپسند اسلامی ریاستوں کے حوالے سے مغربی اور روسی خدشات بھی ان کے پیش نظر تھے۔

وسط ایشیاء سے شمالی افریقہ تک اسلام پسندوں نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنی گفتگوؤں اور انٹرویوز میں موثر دلائل کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ اسلامی جمہوریت کا اپنا ایک ماڈل تیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ کسی ایک شکل پر متفق نہیں۔ کچھ لوگوں کی تجویز ہے کہ جمہوری رویے سیکولر ترکی سے اور اسلامی نظام حکومت کا طریقہ کار پاکستان سے مستعار لے کر ایک نظام ڈھالا جائے۔ اگرچہ ان کی رائے میں دونوں میں سے کسی ملک کا بھی سیاسی نظام مثالی نہیں ہے۔

چند کے نزدیک سعودی عرب سے مالی امداد کے علاوہ ہر شے حاصل کی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ ارض پاک ''اسلام کی محافظ'' ہے اور یہاں مقدس مقامات واقع ہیں۔ تاہم یہ سب کا دعویٰ ہے کہ ان کی مخصوص اسلامی جمہوریت میں تمام سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی ہوگی، تحریر و تقریر پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ لیکن شراب نوشی، عصمت فروشی، منشیات جیسے غیر اسلامی اعمال پر سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ازبکستان اور تاجکستان کے متعدد اسلام پسند نئے جمہوریت پسندوں سے تعاون کر رہے ہیں۔

وسطی ایشیا میں اشتراکی غلبے کو سب سے بڑا خطرہ ستمبر ۱۹۹۱ء میں تاجکستان میں اس وقت پیش آیا

جب جمہوری انتخابات کے مطالبے کے حق میں اسلام پسندوں اور جمہوریت پسندوں نے مل کر دارالخلافہ دوشنبہ میں اپنے ہزاروں کارکنوں کو مظاہرے کے لیے جمع کیا۔ وہ دھرنا مار کر بیٹھ گئے اور یہ اعلان کیا کہ جب تک قائم صدر مستعفی نہیں ہوتے وہ پارلیمنٹ کے سامنے سے ان خیموں کو نہیں ہٹائیں گے جن میں وہ مقیم ہیں۔ اسلام پسندوں کے تعاون کے سبب یہ مظاہرہ بسماچی کی بغاوت کے بعد اشتراکی حکومت کے خلاف سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ آخر کار اشتراکی حکومت کو جمہوری انتخابات کے انعقاد پر رضا مند ہونا پڑا۔ اگلے سال موسم بہار میں اسلام پسندوں اور جمہوریت پسندوں نے مل کر ایک اور دھرنا دیا جس کے نتیجے میں صدر کو ایک متحدہ قومی حکومت قائم کرنا پڑی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ وسطی ایشیائی ریاستیں اپنے نظام میں متعدد جماعتوں کے اشتراک عمل کی اجازت دینے میں جتنی دیر لگائیں گی، تحریک اسلامی میں اتنی ہی زیادہ تلخی بڑھے گی اور ان کی قوت میں اضافہ ہوگا۔ جو اشتراکی حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ اسی ادراک کے پیش نظر ازبک حکومت نے مذہبی تعطیلات کا احیاء کر دیا ہے اور وہ مذہبی ادارے جنہیں روس نے بحق سرکار ضبط کر لیا تھا واگذار کر دیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمام مذہبی جماعتوں پر سیاست میں حصہ لینے اور مذہبی علما کے سیاسی عہدوں کے لیے انتخاب میں شریک ہونے پر مکمل پابندی بھی لگا دی گئی ہے۔ کرغستان میں سیکولر مخالف جماعتوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں آزادی کے بعد سے جو پہلے سات افراد سیاسی قیدی بنائے گئے ان کا تعلق ایک اسلامی جماعت ''العاش'' سے ہے جسے قدیم قازق قائد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان قائدین پر صدر کی ''اہانت'' اور غیر قانونی جلسے منعقد کرنے کا الزام ہے۔

تمام وسط ایشیاء میں کمیونسٹ اس دلیل کی بنیاد پر اقتدار کے دعوے دار ہیں تا کہ سیاسی اسلام کا راستہ روکا جا سکے۔ وسط ایشیا میں مغربی ممالک نے بھی اسلام دشمن موقف اختیار کر رکھا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ جیمس اے بیکر نے وسط ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا تو یہ تلقین کی کہ یہ ریاستیں روس سے آزادی کے بعد کے عبوری دور میں سیکولر ترکی کو عملی نمونہ بنائیں، اپنے ہمسائے ایران کو نہیں۔ مسٹر بیکر نے صرف ایک ہی ریاست ازبکستان میں ابھرتے ہوئے جمہوریت پسندوں سے ملاقات کی۔ انہوں نے اس ریاست کا تین بار دورہ کیا لیکن ایک بار بھی کسی اسلام پسند قائد سے ملاقات ضروری نہیں سمجھی۔ اگرچہ وسط ایشیائی

ریاستوں سے مذاکرات میں امریکہ نے حقوق انسانی اور کثرتیت کے اصول کی اہمیت جتلائی لیکن ان کے اصل پیغام کی نوعیت اتنی ہی اسلام مخالف تھی جتنی جمہوریت نواز تھی۔

الجزائر اور وسط ایشیا میں بش انتظامیہ بھی اسی غلطی کو دہرا رہی ہے جو کارٹر انتظامیہ نے ایران میں کی تھی یعنی تحریک اسلامی کے (غیر معروف) افراد سے مذاکرات کی بجائے ان سے دامن بچایا جائے۔ عام طور پر مغرب نے سرد جنگ سے حاصل شدہ سب سے اہم سبق کو پس پشت ڈال دیا ہے کہ حریف کو زک دینے کے لیے تصادم سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ راستے کھلے رکھے جائیں، خواہ وہ مخالف حقیقی ہو یا فرضی۔ الجزائر میں مغرب کے لیے کہیں بہتر ہوتا اگر وہ اسلام پسندوں کا راستہ روکنے والی مطلق العنانیت کو برداشت کرنے کی بجائے جمہوری نظام پر زور دیتا جس میں اسلام پسند شامل ہوں۔ اسلامی فعالیت سے مغرب کا خوف قبل از وقت ہے۔

ایران اور پاکستان پہلے دو ممالک تھے جنہوں نے وسط ایشیا میں اپنا اثر و رسوخ مضبوط بنایا۔ دونوں نے اپنے سفارت خانے کھولے اور تعاون اور ثقافتی تعلقات پر مذاکرات کی داغ بیل ڈالی۔ ایران کے علی اکبر ولائتی پہلے وزیر خارجہ تھے جنہوں نے علاقے کی ریاستوں کا دورہ کیا۔ فروری [۱۹۹۲ء] میں تہران میں سربراہ کانفرنس میں ایران، پاکستان اور ترکی نے علاقائی تعاون کے ادارہ (ECO) کا احیاء کیا۔ اور اس میں وسط ایشیائی ریاستوں اور آذربائیجان کو شامل کرنے کے لیے توسیع کی۔

ایران کی معیشت کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے جس کی وجہ سے خمینی کے بعد کی حکومتیں علاقائی توسیع کی بجائے داخلی حالات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے پڑوس میں آذربائیجان اور آرمینیا کے تنازعہ میں ایران کی مداخلت قیام امن کی کوششوں تک محدود رہی۔ وسط ایشیا کی اسلامی تحریکوں کو ایران کی نقالی سے دلچسپی نہیں ہے۔ دوسری جانب وسطی ایشیائی امور میں مداخلت کے لیے نہ تو ایران کے پاس وسائل ہیں اور نہ ہی اس کا ارادہ ہے۔ خلیج فارس میں دو جنگوں اور افغانستان کی جنگ کے بعد اس کی توجہ کا مرکز معاشی ترقی ہے تاکہ پورا علاقہ پسماندگی کی دلدل میں پھنس کر نہ رہ جائے۔

۱۹۹۲ء میں ہونے والے ایرانی مجلس کے انتخابات سے اس تبدیلی کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے جو تحریک اسلامی کے شدت پسند حلقوں میں رونما ہوئی ہے۔ ایرانی معیشت اور خارجہ امور کو آزادانہ بنیادوں

پر استوار کرنے کی مخالفت ختم کرنے کے لیے صدر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے جانچ پڑتال کا ایسا نظام قائم کیا جس کے سبب تین ہزار سے زیادہ امیدواروں میں سے قریباً ایک تہائی تعداد انتخابات میں حصہ لینے کے نااہل قرار پائی۔ ان میں اکثریت کٹر انقلابیوں کی تھی جو معاشی اصلاحات مثلاً نج کاری، غیر ملکی سرمایہ کاری، اور مغرب سے تعاون کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔

ملک میں حقوق انسانی کی صورت حال کو بہتر بنانے اور ملک سے باہر شدت پسندانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ایرانی انقلاب کو ابھی طویل راستہ طے کرنا ہے لیکن ۱۹۹۱ء میں لبنان میں اغوا شدہ امریکی اور برطانوی باشندوں کی آزادی میں تہران کا تعاون، کویت اور عراق کی جنگ میں غیر جانب دارانہ رویہ، اس امر کا ثبوت ہے کہ ایران اقوامِ عالم کی برادری میں شمولیت کے لیے سمجھوتہ کرنے اور اکثر دوسروں کی بات تسلیم کرنے کے لیے بھی رضامند ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایران کو اسلامی جمہوریت قرار نہیں دیا جا سکتا، تاہم آج وہ جو کردار ادا کر رہا ہے وہ انقلاب کے ابتدائی زمانے سے بہت حد تک مختلف ہے۔

اسلام اور مغرب کے تعلقات اب ایک فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں۔ ماضی کی کشمکش کو، جو ایران امریکہ دشمنی کے تناظر میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، جاری رکھنا ضروری نہیں ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اسلام کی سیاسی توانائی اور اس کے مستقبل کے امکانات واضح ہونے کے باوجود امریکہ اور اس کے مغربی معاونین کے پاس ابھی تک اسلام سے تعلقات کے ضمن میں اس سے بہتر حکمت عملی نہیں ہے جو انہوں نے ۱۹۷۹ء میں آیت اللہ روح اللہ خمینی کی طرف سے شاہ ایران کا تختہ الٹنے کے بعد اختیار کی تھی۔

جوں جوں اسلام پسندوں کے جذبات میں شدت آ رہی ہے مغرب کے سامنے صرف دو واضح راستے ہیں۔ اول یہ کہ اس وقت سے فائدہ اٹھائیں جب اسلام اور جمہوریت دونوں فروغ پا رہے ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ مسلم اکثریتی ممالک پر سیاسی کثرتیت اختیار کرنے پر زور دے اور پھر آزاد اور منصفانہ انتخابات کے جو بھی نتائج ہوں انہیں تسلیم کر لے۔

جب مغرب کی وابستگی اور حمایت ابتدا سے ہی جمہوریت کے ساتھ ہو گی تو پھر مغرب زیادہ مضبوط پوزیشن میں ہو گا کہ اگر نئی اسلامی حکومتیں جمہوری اصولوں کی پاسداری میں ناکام ثابت ہوں تو وہ انہیں موردِ الزام ٹھہرا سکے۔ اس طرح اس پر اسلام دشمنی کا الزام بھی نہیں آئے گا۔ اس عمل سے مغربی اور مشرقی

ممالک اوران کی ثقافتوں میں کشیدگی کم کرنے میں مدد ملے گی۔

آنے والے چند برس جمہوریت اور اسلام دونوں کے فروغ کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دو ہزاریوں میں جمہوریت صرف مغربی تہذیب وثقافت میں ہی جڑیں پکڑ سکی ہے۔ آئندہ اہم ترین عالمی چیلنج یہ ہے کہ آیا جمہوریت مشرق میں بھی اسلامی اور چینی معاشروں سمیت برگ وبار لانے کے لائق ہوگی یا نہیں؟ یہ حوصلہ افزائی کا وقت ہے نہ کہ تکثیری شکلوں میں اسلام کے اظہار کا راستہ روکنے کا۔

مغرب کے سامنے دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان حکومتوں سے تعاون کیا جائے جو اسلامی تحاریک کو دبا رہی ہیں۔ یہ حکمت عملی، اشتراکیت مخالف حکمت عملی کی طرح مہنگی اور طویل ثابت ہوسکتی ہے اور اس میں مشکلات بھی زیادہ ہیں۔ ناکام معاشی نظام پر استوار کسی نظریے کو چیلنج کرنا اور بات ہے جبکہ صدیوں سے قائم مذہب اور ثقافت کو آسیب قرار دے کر بدنام کرنا ایک بالکل مختلف چیز ہے۔

علاوہ ازیں سرد جنگ کے تجربہ کی طرح اس بار بھی امریکہ کو چند نامناسب دوستوں کا ہاتھ تھامنا ہو گا۔ شام کے حافظ الاسد اور لیبیا کے معمر قذافی کی طرح، بہت سی حکومتیں جو اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے میں پرعزم ہیں، وہ جمہوریت کے بھی خلاف ہیں۔ یہ دوسرا راستہ اختیار کرنے سے، یعنی اسلامی تحریکوں کو ان کے اقتدار میں آنے سے قبل ہی کھلے عام یا خفیہ طور پر کچل دینا، مغرب کے خدشات حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مختلف اور متنوع اسلامی تحریکیں مغرب کے خلاف متحد ہو جائیں اور انتہا پسندی اور دہشت گردی پر مبنی اقدامات کریں۔

آخر میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اسلام پسندوں کا زبردستی راستہ روکنے سے مشرق ومغرب کے درمیان خلیج زیادہ وسیع ہو جائے گی جو کہیں زیادہ خطرناک اس لیے ہے کہ ایک خونی تاریخ پہلے سے اس کی پشت پر ہے۔ احیائے اسلامی مغرب کے لیے ایک زبردست آزمائش کے ساتھ ساتھ حالات سدھارنے کا ایک سنہری موقع بھی ہے۔

[Robin Wright, "Islam, Democracy and the West", *Foreign Affairs,* Summer 92, Vol. 71, Issue 3, p. 131, 15p.]